جلاوطن کی شاعری

اجمل خٹک

جلاوطن کی
شاعری

جلاوطن کی شاعری

اجمل خٹک

پاکستانی ادب پبلیکیشنز کراچی

نام کتاب	جلاوطن کی شاعری
مصنف	اجمل خٹک
خطاطی و سرورق	سلطان احمد
ناشر	پاکستانی ادب پبلکیشنز کراچی
پرنٹر	ذکی سنز پرنٹرز
باراوّل	مئی ۱۹۹۰ء
قیمت	۹۰/- روپے

ترتیب

حرفِ اوّل

یہ ہے اردو نظمیں کہنے کی میری پہلی کوشش۔ جس پر میری اپنی تنقید یہ ہے کہ اِن آزاد نظموں کے صرف الفاظ اردو زبان کے ہیں۔ باقی لہجہ، غنائیت، ایمائیت، پس منظر اور رُوح سب کچھ پشتو کا ہے۔ نہ معلوم پڑھنے یا سُننے والے اصحاب میری اِس کوشش کو کس نظر سے دیکھیں گے۔ میں خود سمجھتا ہوں کہ جن عوام کے لیے میں نے اپنی زندگی اور زندگی کا سب کچھ جدوجہد کی بھینٹ چڑھایا ہے۔ اُن کی خدمت میں اُن سب کی سمجھنے والی زبان اردو میں اپنے شعر و فن کا ہدیہ بھی پیش کروں۔ یہ میرے محبوب عوام کا مجھ پر حق ہے۔

میں مقصد کی خاطر میدان میں کُود پڑتے وقت کبھی بھی کامیابی اور ناکامیابی کو خاطر میں نہیں لایا۔ بلکہ اپنا فرض سمجھ کر قدم بڑھایا ہے۔ یہاں بھی کسی داد و بیداد کی پرواہ کیے بغیر جب یہ نظمیں وارد ہونے لگیں تو لکھ ڈالیں! اور اب پیش کر رہا ہوں۔

میں اچانک اردو شعر کیسے کہنے لگا۔ اس کا پس منظر بھی ہے اور عوامل بھی،

مگر اس کے اظہار کا یہ موقع نہیں۔ مختصراً عرض کروں کہ اس سلسلے کی پہلی نظم جو وارد ہوئی اس کا نام ہے "من کا من"۔ پڑھنے والوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ میری اس شاعری کی جو حقیقت ہے وہ اس نظم میں آشکارا ہے۔ گویا یہ نظم میری اردو شاعری کا مضمون بھی ہے، عنوان بھی، تمہید بھی اور دیباچہ بھی۔

اجمل خٹک

۱۴ ردسمبر ۱۹۸۹

من کا مندر

دیوی کون ؟
کون پجاری ؟
کس کا درشن
پُوجا کیا ؟
من کا مندر ۔ کیسا مندر

رام ہی جانے
یا جانے ہے میرا بالم
—
میرا بالم ؟
جھیلوں کے اُس پار
ساحل ساحل شانتی شانتی
دھرتی پھول
آکاش ستارے
قطرہ قطرہ پیار کا موتی
ذرّہ ذرّہ حُسن کا جلوہ
سُندر دیش کی اِک شہزادی
حُسن کی نیلم پری ۔
میرا بالم !
وہ کیا جانے من کا مندر
رنگ محل کی رانی ہے وہ

سونا چاندی جگمگ جگمگ
جس کو دیکھا اُس کا مجنوں
جس سُو جائے پیار کا عالم
خوشیوں کے گہوارے میں
جوبن کی مستی سے چُور
عیش و طرب
دم دما دم طبلہ تالِ
چھن چھنا چھن پائل ناچ
نئی جوانی
دھڑکن دل کی بے ہنگم
آنکھوں میں خمار
بے قابو جذبات
اُس کی چاہ تو
ہر صبح ایک تازہ پھول

ہر شب ایک انوکھا رنگ
انجانی مغرور حسینہ
وہ کیا جانے من کا مندر۔

من کا مندر
یہ کیا شئے ہے ؟
اِس سے اُس کو کیا
من کا مندر
میرا من
اِک سنسار ویرانہ سا۔
خوف ، دہشت اور خاموشی
نہ کسی نے سنکھ بجایا
نہ کوئی آیا دیا جلانے
نہ کوئی گُزرا پھول چڑھا کے
نہ کسی رہرو نے کبھی

پیچھے مڑ کر دیکھا تک

کیسا مندر ؟

کیا ہے من ؟

دیوی کون ؟

کون پجاری ؟

جس کا درشن ؟

پوجا کیا ؟

ہاں

اُجڑا ، ٹوٹا سا اِک گھر

چھت مکڑی کا جالا

دیواریں جنّات کا روپ

خوف ، دہشت اور خاموشی

مردنی ، پژمردگی

کیا کوئی آئے

کیوں کوئی دیکھے

یہ
اِک تنہا کونے میں
دُور
جیون کے بازاروں سے
زور اور زر کی نظروں سے
حُسن کے دلالوں سے
عدل کے قصابوں سے
مہر کے جلّادوں سے
دُور
اِک دیا جلتا ہے۔
کچّی مٹّی کا دیا
دل کے خون سے روشن لو
پیار، ایثار، وفا، سب کچھ

دور اس تنہا کونے میں
دُور اک دیا جلتا ہے
ٹمٹماتا جلتا ہے
جلتا ہے اور جلتا ہے
مرتا ہے اور جلتا ہے
نہ کسی کے پیار کی آس
نہ کسی کے ظلم کا خوف
اندھیرا ہو آندھی ہو
زلزلے ہوں طوفاں ہوں
کچی مٹی کا دیا
دل کے خون سے روشن لَو
جلتا ہے اور جلتا ہے
اپنا چھوٹا سا سنسار
روشن کرتا رہتا ہے

اس کا دل
کالا تِل
سوکھا پھول
حسرتِ یاد
بربادی میں آباد
کیوں ؟
کون ہے جو یہ جانے ہے
رام ہی جانے
یا جانے ہے من
من کا مندر
میرا من ۔

کابل، ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۲

دُکھی دل

دکھی دل میرے!
کیوں تُو روئے
آشا کیا؟
تسلّی کون؟
سب کچھ پرایا
ہر شے بگانی

پگلے

ہر کوئی اپنی دھن میں مست دِوانہ
تیرے نیر خون کے موتی
ماٹی میں گرے ماٹی
پتھر دل میں ترس کہاں
غیر کے نگر میں اپنا کون
دکھی دل میرے
دُکھتارہ
پر روتے کیوں
ہنستا جا
زخم کی مانند
خونِ دل
سوز جگر سے
کانٹوں کی اس نگری میں

پنجرے، جال اور پنکھ پکھیرو
اک سندیسہ دیتا جا
مر کے بھی اے ٹوٹے تارے
منزل روشن کرتا جا۔

دکھی دل میرے
پگلے!
کیوں روئے!

کابل، ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۲

من کے دل پر داغ

پیالہ تھا شراب کا۔

وہ شراب
آدم نے حوّا کی آنکھوں میں دیکھی
تسنیم و کوثر بھول گیا
حور و غلمان چھوڑ گیا
وہ شراب!

واعظ دیکھے منہ میں پانی بھر بھر آئے
ملّا سونگھے تسبیح اور مصلّہ ہارے
پیر۔ قبا و عمامہ
خان کا شملہ اور غرور
لیڈر۔ کرسی، اسٹیج، تقریریں
سب کچھ بھولیں
دن اور رات بس ایک ہی شغل
بُت بنا کر پوجیں پیالہ
اور شراب میں غسل کریں
وہ پیالہ
چین کا وہ شفّاف بلور
نہیں نہیں
چاندنی جو مجسم تھی
نہیں نہیں

اُس میں حسُنِ جوانی کہاں
ناز، ادا، یہ نرمی گرمی
وہ احساسِ جمال
وہ غرورِ حسُن
وہ سحرِ وصال
جس کو اس کا خالق دیکھے
چُومے اپنے ہاتھ
پیالہ تھا شراب کا
چاندی کے سیّال چشمے میں
عکس تھا گلاب کا
چمک تھی رعنائی کی
روشن تھا اک شعلہ سا
دل کے طُور پہ نور بن کر
ہر ذرہ چمکایا

پیار کا خوں گرمایا
اُس کا وہ انگوری رنگ
جادُو اور خمار
نس نس میں سرایت
عقل و ہوش، تدبیر و پرہیز
اِس دُنیا کی ہر ایک شے
اس کے سامنے ہیچ
دل مست و مخمور، بے قابو
آنکھیں بس نچھاور
ہاتھ بڑھنے کی دیر
پیالہ کے نشیلے ہونٹ
بوسہ کا پیغام
نشّہ کے رنگیلے سپنے
مستی اور خمار

عقل، ہوش، تدبیر، پرہیز
اس گیتی کے سب دستور
ہیچ۔
ماضی، حال، مستقبل
گم۔
ہاتھ بڑھنے کی دیر
پیالہ بھی تیار
سرخ شراب بھی اپنی
دعوت کا ماحول
وصل کا انداز۔
میرا دُکھی دل
حسن کا محروم پجاری
دھرتی کے مظلوم لہو کا لعل
دنیا کے بےکس پسینہ کا یہ گدلا موتی

سراسر ذوقِ جمال
پیار، اس کا ایمان۔
اس کے ارمان
دھوپ جلے انسانی دل کو تھوڑا سا سُستا لے
کانٹوں سے چھلنی دل کو
ہنستے، کِھلتے پھولوں کے رنگیں سائے میں بٹھائے
اس کے سوکھے ہونٹ
پیار کے قطروں سے تر ہوں۔
اُس کی خشک جوانی
رُت آئی بہاروں کی
بھیگی رات برسات کی
حسرت اور ارماں

میرا دُکھی دل
سنگ نہیں ہے خِشت نہیں

یہ بھی ہے انسان کا دل
اِس نے یا تو دکھ دیکھے
یا
محنت کی اور خدمت کی
بوجھ اٹھائے ظلم سہے۔
اِس کی زندگی کام اور کام
یہ اُگائے پھول
اِس کے لیئے کانٹے
اِس کے خون سے سینچا ہوا باغ
اس کے لیئے پنجرہ
اس کا پیار، محبت، ذوق
اس کے لیے عذاب۔
جو خوبصورت شے بنائے
دوسروں کے دل کا سُرور
اِس کو دے بربادی۔

اِس کا کلچر، اِس کا فن اور اس کا دین
روز و شب کی محنت
غیروں کی عیاشی۔
اِس خوبصورت شہر میں یہ غیر، غماز، پرایا
اِس بھرے بازار میں یہ اجنبی گنوار
پیار سے کوئی دیکھے بھی تو
یہ سمجھے اِک خواب۔
پھول اور پھل پکڑائے کوئی
یہ سمجھے مذاق۔
پیالہ یہ شراب کا
دعوت کا ماحول
وصل کا انداز
اِس کے لیے وہ اجنبی اُس کے لئے یہ۔
اُس کو دیکھے جی للچائے

خود کو دیکھے لرزہ طاری
حیرت، خوف، تشویش
نیم دیوانہ پاگل
خالی خالی آنکھیں
بھوکی بھوکی نظریں
ڈرتے ڈرتے پیار سے دیکھے
پیالے کے نشیلے ہونٹ
دل کو گد گدائیں
سرخ شراب جادو کا شعلہ
لہو کو گرمائے
حسرت بھرا دِوانہ دِل
دیکھے تو اِک لذت
سوچے تو بس حیرت، خوف، تشویش
سراپا مسحور

دُور کھڑا اک بُت کا بُت
حیرانی کے پردے میں جذبات کا اک طوفان۔
جیسے اِک خاموش ساگر کے سینے پر
لہریں اور چندا کا عکس
گلے ملیں اور بوسہ لیں۔
بیداری میں خواب
یہ نرالا کیف
تا ابد اِک یاد
من کے دل پر داغ

کابل، ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۲

پریت نگری

ساقیؔ!
میری دُنیا تیرے پیارے قدموں پہ نثار
لا اِدھر اِک اور
وہ جام
جو
دل کی اُجڑی دُنیا میں

بہاروں کا رنگ بھر دے۔
اِس سُنسان ویرانے پر
پیار کے بادل برسیں۔
حسُن کی رنگین بہاریں
لہکتی جوانی کا کیف و سرور
نشہ بن کر رگ رگ میں سمائے۔
تُو اور تیرا جادو سجنا!
دل پر میرے چھائے
جیسے ساون کی رُت ہو
بھیگی بھیگی رات
چاند کے سندر مکھڑے پر گھنگھور گھٹائیں آئیں
میرا دل، دماغ
عقل، ہوش، تمیز
میرے دُکھی جیون کے یہ گلے سڑے داغ

سب تیری مخمور جوانی کے جوبن میں
ڈھل جائیں ، بہہ جائیں
اور مجھے تنہا، مست، بے ہوش
اس پاپی جگت سے کہیں دُور پرے لے جائیں
یہ پاپی جگت
جس میں ساری عمر
میں نے یا تو دل کا خون پیا ہے
یا
اپنی زندگی کا زہر
یا
سوکھے ہونٹ
زبان پر کانٹے
کروٹیں بدل بدل کر حسرتوں میں سویا
اس بے ترس، بے رحم ظالم دنیا نے

مجھ کو
میرے دل کو
میری ترستی نگاہوں،
سلگتے ارمانوں
اور سسکتی جوانی کو
میرے سب جذبات کو
ساری خواہشات کو
ذوق اور تقاضوں کو
جبر و استحصال کی
غیر مرئی زنجیروں میں جکڑا کر
مفتی، قاضی، ملّا جی نے
موم کی ناک
فتووں میں
جیسے مالِ غنیمت

بانٹا اور بس کھایا۔
خان، سردار اور چودھری نے
اپنے گھر کی لونڈی
رسم و رواج میں
جیسے
پتّا ہو تمباکو کا
آگ لگا کر دھُواں بنا کر اڑایا
اس خوبصورت دُنیا میں
رہ کر بھی
یہ ہم جیسے لوگ
بس اندھے بھکاری ہیں
سُنا ہے تو سب کچُھ پر
دیتے ہیں دعائیں بھی
کچھ بھی نہیں دیکھا ہے۔

ساقیؔ!
میری یہ دنیا
تیرے پیارے قدموں پہ نثار
لا ادھر اک اور
وہ جام
جس کا بس اِک گھونٹ
تیرا حسن، تیری جوانی، تیرا جوبن
پریت کا نشّہ بن کر
مجھ پہ ایسا چھائے
جیسے ساون کی رُت ہو
بھیگی بھیگی رات
چاند کے سُندر مکھڑے پر گھنگھور گھٹائیں آئیں
میرا دل و دماغ
عقل، ہوش، تمیز

میری ساری ہستی
حسن و جوانی کے ساغر میں نشّے کی مانند
گُم رہ کر بھی مستی دے
ساقیؔ!
تیری مست نگاہیں
میرا پیار
اِک حسین انگڑائی
اِک رنگیلا خواب
قوس و قزح کے رنگوں میں
پریت نگری بسائیں۔

کابل، ۲۳ر دسمبر ۱۹۸۲

جنّت

میں نے پوچھا
حضرت مولانا!
یہ جو تیری جنت ٹھہری
آخر ہے کیا؟
اُس نے اپنا پہلو بدلا
دائیں ہاتھ کو توند پہ رکھا

ہونٹوں پر زبان
بولا' واہ!
تازہ تازہ پھل
دودھ کی بہتی نہریں
پانی بھی شراب
واہ جنت!
آہ جنت!!

پاس ہی اُس کے بیٹھا تھا
اِک شاگرد، مُرید
جھولی میں "یوسف زلیخا" کی کتاب
اُس میں اِک چھوٹا سا آئینہ
آئینے میں دیکھے اپنا محرومی کا چہرہ
پڑھے مزے لے لے کر زلیخا کے اشعار
میں نے پُوچھا

اچھے صاحبزادے!
تیری رائے کیا؟
بولا واہ!
سرخ گلابی ہونٹ،
سبز مستانہ تِل
واہ جنّت!
آہ جنّت!

اُس طرف سے آ نِکلا اِک موٹا تازہ شیخ
سُرمہ بھری آنکھیں
لمبی لمبی داڑھی
میں نے پوچھا
شیخ جی!
جنت کے ہیں معنی کیا؟
بولا واہ!

موٹی موٹی تازی تازی حوریں

سوہنے مُنڈے

وہ خوبصورت لڑکے

واہ جنت!

آہ جنت!

مسجد میں مغرور بیٹھا تھا اُس قصبے کا خان

ہاتھوں میں تسبیح زبان پر گالی کی بوچھاڑ

میں نے پوچھا

آپ فرمائیں؟

مونچھوں کو بل دے کر

اپنے لمبے شملے کو اِک جھٹکے سے لہرا کر

بولا واہ!

سونے چاندی کے محل

میووں کے باغات

واہ جنت!

آہ جنت!!

دور کھڑا تھا میں نے دیکھا گاؤں کا دہقان

تھکا ماندہ پُتلا

رُوکھا سُوکھا چہرہ

میں نے پوچھا

تم نے بھی سُنا تو ہوگا اس قسم کا نام

اپنے گدلے دامن سے

ماتھے کا پسینہ پونچھا

بولا واہ!

صاحب

پیٹ بھر کر سُوکھی روٹی

میٹھی میٹھی نیند

واہ جنت!

آہ جنت!!

میں نے اپنے دل کو دیکھا
یہ پگلا بے قابو
اوپر نیلی چھت کو دیکھے غصّے سے تھرّائے
اور کچھ بڑبڑائے
میں نے کان لگا کر سُنا
اُس کا یہ اعلان

اے!
تو لامکاں کا مالک!
اس بھری دنیا کا مالک میں
میں تیرا انسان
یہ میرا اعلان
اس کا مالک کوئی نہیں

اپنی رائے ، اپنی آزادی ، اپنا دستور
اپنی محنت ، اپنا پھل ۔
آشتی، امن ، شانتی
یہ ہے جنت
ورنہ جدوجہد
اس راستے میں سولی آئے
پھندہ جنت
اس راستے میں دوزخ آئے
شعلہ جنت
آہ جنت !
واہ جنت !!

کابل، ۲۳ ؍ دسمبر ۱۹۸۲

موم کا پتھر

سنگ کو موم بنانے والے موم کو پتھر بنا
سجنا ، رام ، خدا
میرے پیار کی اچھی دیوی
دل کا نازک شیشہ میرا
وہ پڑا ہے دُور
چُور ، چُور ، چُور

ایک حسین نظر کی زد میں
اِک پیاری ادا کے آگے
اک رنگیلے خواب کی گود
میں سمجھا تھا اس کو سنگ خار
یہ تقدس آدرش، غیرت، ہمت کا گنبد
یہ بے چارہ
بہتے پانی کے سینے پر بُلبلا بے بس
زندگی کے سارے ارماں
منزل کی امیدیں
ساری جدوجہد
بن رہے ہیں اِس نشّے میں دھُندلے داغ
بلکہ میری ذات
اس حسین رنگین اُفق پر
جیسے شام کا تارا

ہولے ہولے دور پہاڑوں کے پیچھے گر جاتے۔
دُور سپنوں کی نگری میں
اِک پری کے سینے پر
کہتے ہیں
امرت کا اک چشمہ ہے
جُھوٹ
نشّے کا تالاب ہے۔
اُس میں ڈوبے اور گم ہو
میری ذات
فکر، عمل، احساس، تجربات
میری جدوجہد
جیل کی کالی کوٹھری
لوہے کی زنجیریں
قید و بند تعزیریں

کوڑے اور پٹائی
آدرش کے آستانے پر قربانی کے پھول
سب سدا بہار
پیچھے چھوڑ کے جاؤں۔
وقت کا بے رحم ریگِ رواں
سب کو اپنے دامن میں سمیٹ کے
فنا کے اندھے کنوئیں میں گر جاؤں
اور
دھرتی کے محروم انسان
میرے اپنے قصبے کے غریب
موچی، نائی، جُلاہا، دھوبی اور ترکھان، لوہار
یہ بچارے کسان
جن کی پوری نسلیں،
زندگی اور گھرانے،

خدمت، خواری اور مصیبت۔

خان کے استحصال کے سنگیں پنجے میں
سینہ لاکھوں زخم، درد، پکار
پر زبان خاموش
ان کے سارے دردوں اور ارمانوں کی تسلی
بس میری آواز
اس کو لے کر اک حسین کے پیارے پیارے قہقہوں
کے شور میں
گُم کر دُوں؟
سجنا، رام، خدا!
میرے پیار کی دیوی!
موم کو پتھر بنا!

کابل، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۲

دیش ماتا

روح میں رچی بسی اِک آواز
دیش ماتا۔ دیش ماتا۔
میرا آدرش، میرا جیون، میرے خواب،
زندگی اور موت
دیش ماتا۔ دیش ماتا۔
یہ ساز و سنگیت

میٹھے سُر اور تال
جادو بھری آواز،
گرماتے ہیں دل کو اس کے پیارے پیارے بول
دیش ماتا۔ دیش ماتا
نیتاجی کی تقریروں کے اندر سارا زور
جلسوں میں، جلوسوں میں یہ اتنی گرماگرمی
نعروں میں یہ جوش،
راج اور اس کے منڈل میں
چکنے چپڑے وعدے،
منتخب ایوانوں میں
بھاری بھرکم لفظوں کی بوچھاڑ،
فوج کا ہر جرنیل
اُس کی سیوا پر مغرور
عدل کے ترازو پر

اس کے آنچل کا سایہ
صدر کا بلند و بالا محل
اس کے چرنوں کی خیرات
یہ مقدس جھنڈا
جس کے آگے جھکتا ہے ہر سر
سب کا دل و جان
نام پہ اس کے لہراتا ہے
شان پہ اس کی اونچا ہے۔
یہ حکومت ، یہ سیاست' یہ بازار
چلتا ہے اس کا سکّہ
بجتا ہے اس کا ڈنکا۔
دیش ماتا، دیش ماتا،
وہ دیکھو!
آسمانوں سے باتیں کرتے برفیلے پہاڑ،

پریوں کے استھان ۔

یہ دیکھو!

گاتے، ناچتے دوڑتے، بہتے دریا

قطرہ، قطرہ امرت ۔

لو سُنو یہ پنچھی!

جیسے اُڑتے پھول

سُندر، نازک چونچ

مدھ بھرے سنگم کے سارے راگ

یہ فضا،

یہ ہوا،

یہ زمین و آسمان،

ایک ہی دُھن

دیش ماتا ۔ دیش ماتا

زندگی کی گہما گہمی،

چڑھتے سورج ، گرتے تارے ۔

اِدھر دوڑیں کاریں ،

اُدھر تُلے دَھن ،

یہ بہے پسینہ ۔

وہ کہیں سے آتی ہے اِک دردبھری آواز

ماں ، ماں ، ماں ۔

اوں ، اوں ، اوں ۔

ماں ، ماں ، ماں ،

وہ اک چھوٹا بچّہ ہے

پاؤں ننگے ، سر ننگا اور پیٹ بھی ننگا

بائیں ہاتھ سے آنکھیں مَلے

دائیں میں پلاسٹک کی اک پُڑیا

چھلکے کسی پھَل کے

چُوسی ہوئی گٹھلی ،

کانٹا، ہڈی، کچرا
جو کسی صاحب نے ابھی موٹر سے پھینکا
اُدھر سے وہ بھوکا کتّا دوڑا
اِدھر سے یہ ننگا بچہ لپکا
لڑکے نے اُٹھایا۔
کُتّا بچارا ہارا۔
وہ مایوسی میں پُڑیا کو گھورے اور للچائے۔
یہ کُتّے سے ڈرے
روئے اور پُکارے
اوں، اوں، اوں
ماں، ماں، ماں
اور ماں
ماں عورت مزدور
چیتھڑوں میں ہے لپٹا ہوا ہڈیوں کا ڈھانچہ

بھوک، مرض، تکلیف، مشقت، مایُوسی
پیٹھ سے باندھے ہے اپنا اک اور چھوٹا سا بچّہ
سر پر اینٹیں بار،
ٹھٹھرتی ہے سردی سے
چُور ہے تھکاوٹ سے
لرزتی ہے خوف سے،
زرد پتّا خزاں کا
وہ کھڑا ہے ٹھیکہ دار
غصّہ، گالی، قہر
بچّے کی صدا سُنے تو جھڑکیوں کی بارش
ماں جو مُڑ کر پیچھے دیکھے،
ذرا قدم سُست اُٹھائے
غضب، ڈانٹ، سزا۔
اک طرف سے لاڈلے کی فریاد

ماتما کو پکارے

دوسری طرف مزدوری کا چکر

بھوک، پیٹ، زندگی

سر پہ ٹھیکہ دار

جبر و استحصال

انسان اپنی دنیا میں سرمائے کا غلام

ماں مزدور

ماتما مجبور

زخمی اور مظلوم

دیش ہے دھرتی کے دامن میں جنّت کا نمونہ

ماتا دیش کے سینے پر مجبوری کا اک پھوڑا

چاند ستاروں کی دنیا سے برستا ہے نور

آسمانوں سے باتیں کرتے برفیلے پہاڑ

پریوں کے استھان

گاتے، ناچتے، دوڑتے، بہتے دریا
قطرہ قطرہ امرت۔
لو سنو یہ پنچھی،
جیسے اُڑتے پھول
نازک سُندر چونچ
مدھ بھرے سرگم کے سارے راگ
یہ فضا، یہ ہوا،
یہ زمین و آسمان
ایک ہی دُھن
اُوں، اُوں، اُوں،
ماں، ماں، ماں
ماتا
دیش ماتا، دیش ماتا!

دہلی، ۱۵ر جنوری ۱۹۸۳

میرے خُوں کا پہلا قطرہ

میرا بس چلے تو دُنیا بھر کے سارے پھول
چُن چُن کے لے آؤں۔
آسمانوں کے چاند تاروں کا جگمگ کرتا نور
مشعلیں بناؤں۔
میرا بس چلے تو اِس حسین دھرتی کی حوریں،
پیار کے روشن دیپ،

دیش دیش کے البیلے، متوالے نوجوان،
جن سے قائم زندگی کی رَونق،
انسانی شرافت، محنت، قربانی کے پُتلے،
بوڑھے اور جوان۔
میرا بس چلے تو ساری دنیا سے کہوں کہ
میلے کریں اور جشن منائیں۔
اس شہر کی اس پُرانی گلی میں
گدلے پانی کی یہ نالی،
یہ جو۔
ٹوٹی پھوٹی اینٹ ابھی تک ہے۔
اس کو چُومیں،
ناچیں، کودیں، گائیں،
ٹوٹی پھوٹی اینٹ
جس پر ٹپکا میرے گرم خوں کا پہلا قطرہ

اِس طرف سے نعرہ تھا "انگریز نکل جاؤ"
اُس طرف سے لاٹھی، گولی، جیل۔
اِس طرف سے آزادی کے دل جلے پروانے،
خالی ہاتھ۔
اُس طرف سے گوروں، کالوں، زردوں کی افواج،
سنگینیں، بندوقیں، آرمرڈ کار

ہم،
جنگِ آزادی کے متوالے لڑکوں کا اک چھوٹا سا دستہ
گوپی، بترا، اندر سنگھ،
شانتی اور لیلا،
آگے آ گئے ہیں
پشتو کی سرمستی سے دیوانہ
آزادی کے جذبے سے سرشار
خدائی خدمت گار

گورا چیخے

ہالٹ!

ہم پکاریں

"کتو نکل جاؤ"۔

گھوڑے پر سوار گورا کچھ زور سے بڑبڑایا

وہ کچھ کالے دوڑے

لاٹھیاں لہرائیں

ہم پر ایسے لپکے جیسے بھوکے جنگلی بھیڑیئے

یا ہمارے خان بابا کے "تازی شکاری کتے"۔

اِس پرانے شہر کی اِک گلی،

گدلے پانی کی نالی،

ٹوٹی پھوٹی اینٹیں،

آج بھی سُونگھیں تو وطن کی مٹی

آزادی کی راہ میں گرا خون کا ہر اِک قطرہ

ماضی کا آئینہ

انساں گونگے بھی بن جائیں
کہکشاں کا روشن سینہ سارا سچ بتائے
سبز ہلالی پرچم ہو یا چکرّ اور ترنگا
آزادی کی لیلا کا سیندور
گھوڑے پر سوار دولہا کی خوشیاں اور غرور
پُوچھو تو ایمان سے کہہ دیں
خون کا گرم قطرہ
اور
گدلا سا پسینہ
جس کا صرف ایک رنگ
سُرخ عقیق
ایک مذہب
محبّت!

ایک نعرہ،
امن!
ایک ہدف
دھرتی بنے جنت!

دہلی، ۲۲ر جنوری ۱۹۸۳

ہم جو

ہم جو اِس شہر کے باسی ہیں مسافر ٹھہرے
بے رُخی سمجھیں اسے یا کہیں حالات کا رنگ
آج ہے جشن کا دن
رنگوں کی ہولی، میلہ
تازہ پھولوں کی بسنت
ہم سجاتے ہوئے سینوں میں ہیں زخموں کی بہار

ذہن کی جھیل پہ لہروں کے تلاطم کا سماں
دل کے آئینے میں گزرے ہوئے حالات کا عکس
اُف!
یہ یادوں کا ہجوم
ہائے!
ہم صفیرانِ قفس اور حریفانِ چمن
عشق کا جوشِ وَفا
تپشِ غیرتِ خون،
سرِ مجنوں ہدفِ سنگِ جفا،
زخم لگتے بھی تھے، رِستے بھی تھے، جلتے بھی تھے
ہر قدم منزلِ جاناں کی طرف
سر گرے تو بھی نظر کعبۂ ارماں کی طرف
ہم جو اِس شہر کے باسی ہیں ہمارا قِصّہ
رسمِ وفا

عہدِ رضا

بے رُخی سمجھیں اِسے یا۔
آمدِ موسمِ گل سے پہلے
موجۂ نکہتِ بادِ سحری
جلوۂ نورِ صبا،
خلوتِ شب کے گریباں سے نکل آیا تو
شعلۂ آتشِ خوں، زمزمۂ زہرِ عناد،
لُٹ گئے اہلِ وطن
جَل گئے فصل و چمن

مژدۂ بادِ صبا لطمۂ صرصر نکلا

ہم جو اِس شہر کے باسی ہیں ہمارے ارماں
اک مسافر کی طرح دردبھری یادِ وطن
ہم نوایانِ چمن،
ہم سفیرانِ قفس،

فکرِ منزل، غمِ فردا، عملِ عہدِ وَفا
عمر بھر سازِ دل و سوزِ جگر۔

دگمہ (نگہت)

آیا تو بہار کا مژدہ
پھولوں کی رنگینی
پیار کی اَمر دیوی
نور کا ایسا شُعلہ
جس نے دل کے کونے تک کو جگمگایا۔
پیار کا ایسا نشّہ

پھول جسم کا عطر جس نے رگ رگ میں سمایا
دل کا اجڑا باغ ،
محرومی کا دوزخ ،
آتشِ نمرود
اُس کی زلفوں کے سائے میں جنت کا نمونہ
دگمہ !
آیا تو بہار کا مژدہ
گزرا تو خدا کا غضب
رعد، بجلی ، کڑک
جِس نے بس اک لمحہ میں
میرے دل کا خرمن ،
ذہن کا خزینہ
پیار کی نئی کِھلتی ہنستی دُنیا
قدم قدم لمحہ لمحہ ،

دہکتے انگاروں کے طوفان میں بدل ڈالا

اے دنیا کے لوگو!

اے میرے خدا!

اے دلِ ناداں!

آخر یہ ہے کیا؟

حسن،؟

پیار؟

وفا؟

یا

میری خطا؟

اے میرے خدا!

یا تو جانے ہے

یا ذوقِ جمال۔

کابل، ۳ر جنوری ۱۹۸۳

اے میرے سلگتے دِل

اے میرے سُلگتے دل
آتش کھاتا جائے ہے
دھواں بنتا جائے ہے
اپنے ارمانوں کے انگاروں پر جیتا جائے ہے
اے میرے سُلگتے دل
اے میرے سلگتے دل

تو محبّت کی کلی
محبت کا خزانہ ہے
تجھ سے پھولوں کی نِگہت
تجھ سے فصلوں کی بہار
پر اس جھوٹی دھرتی میں مُرجھائے ہے مرجائے ہے
اے میرے سلگتے دل
اے میرے سلگتے دل

—

میں تیرے قربان اے دل
لو گھٹائیں چھٹ گئیں
اندھیروں کے دل ٹوٹے
مُرغِ سحر نے دی صدا
کوہ و صحرا پھول بنے ہیں کوہ و دشت مُسکائے ہیں
تو بھی کِھلتا جائے ہے

اے میرے سُلگتے دل

—

اُونچی اُونچی چوٹیوں پر سرخ سویرا چھائے ہے
تیرا موسم آئے ہے
اے میرے مُسافر دل
اے میرے سلگتے دل۔

کابل، ۶ر فروری ۱۹۸۳

خلاء

سارے دِیئے بجھ گئے بس
اب اندھیرے سائے ہیں
زندگی بھُوتوں کی دنیا
خواب بھی اب پرائے ہیں
جیون کے بہانے لوُٹے
ارماں چکنا چوُر ہوئے

اپنا تن اک گہری دلدل
اپنے من سے دور ہوئے
پیاس بُجھانے والے آئے
دل کا مندر توڑ چلے
پیار کے پنچھی اُڑ اُڑ بھاگے
سُوکھے تنکے چھوڑ چلے
اب یہ اپنی ساری ہستی
سپنوں کا کھلونا ہے
خالی خولی حرکتیں ہیں
ہنسنا ہے کہ رونا ہے۔

کابل، ۲۰ ستمبر ۱۹۸۳

دُور کے ڈھول سُہانے

کاسوں میں بھی تشنگی تھی،
پھولوں کے دل پر بھی داغ،
مَن نے جو سہارے ڈھونڈے،
سارے صحرا کے سراب
دُور کے ڈھول سہانے سانگھی!
دُور کے ڈھول سُہانے

کابل، ۱۵ر جولائی ۱۹۸۳ء

مارشل لاء کا نیا ترانہ

نام خدا کا لو مگر
ظِلُ اللہ بندوق ہی ہے
کلمہ پڑھو چِلّا کر
پر کعبہ ڈالر کے رُخ
یہ ریاست، یہ قدرت
"ھٰذا مِن فضلِ ربی"
دائیں بائیں، آگے پیچھے

یہ پٹے سیاست کار
کھوٹے سکے، جھوٹے نوٹ
لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ

سب اچھا!
اور سب کچھ ٹھیک
کیا کر سکتے ہیں عوام
"زندہ باشد چچا سام"

کابل، ۱۱ جون ۱۹۸۳

زندگی

سامنے یہ زندگی کا سیلِ ناپایاب ہے
تندیٔ جوشِ طبیعت تیزیٔ رمزِ حیات
پُرخروش۔
پتھروں کو توڑتا، کوہِ گراں کو چیرتا
تنگنا و پیچ و خم سے بے نیاز

ایک یلغارِ مسلسل
ایک پیہم دار و گیر
ہر طرف کالی چٹانوں کا جمود
اس کی موجوں کی سراندازی کے آگے پاش پاش
ان سیاہ چٹیل پہاڑوں کا جمود
اس کے سینے کی تلاطم خیزیوں سے تار تار
شیرِ غرّان،
فیلِ مست،
قبر، زنجیر و قفس
اُس کی سرمستی کے آگے قصّۂ خاشاک و خس
جس طرف رُخ کر گیا
وہ بڑھ گیا
لو چڑھ گیا
نہ لحاظِ قبۂ دیر و حرم

نہ نیاز دبدبِ قصر و جلال
چونٹیوں کی سرکشی کو اپنی مُٹھّی میں لیئے
بھر رہا ہے سیم و زر سے ریت کا
دامنِ بیچارگی ۔
لا رہا ہے چاند تاروں سے چمک
دے رہا ہے تیرگی و خیرگی کو قوّت و نور و سُرور
خاکدانِ ارضِ غم سامان کی ہر پژمردگی
نو بہ نو حرکت سے اس کی زندہ و تابندہ ہے
اسکی قوّت، اس کی مستی اس کا زور
راہ کے سنگِ گراں کے سر پہ قہر
اک خزینہ نور کا
کاروانِ رنگ و بو
حجلۂ حُورِ بہار
مظہر غیظ و غضب یہ مضمرِ حُسن و کمال

ہمتِ ملاح اس کی رحمتوں سے باریاب
جراءتِ غوّاص اس کی نعمتوں سے بہرہ ور
فکرِ کم اندیش پر لرزہ ہے طاری دُور سے
مردِ کوتاہ بیں صیدِ وہم و یاس
عرصۂ امروز و فردا یہ نقوشِ روز و شب
اِس طرف ذوقِ حیات
اور اُس طرف احساسِ مرگ
سامنے یہ زندگی کا سیلِ ناپایاب ہے
پُرخروش
رواں دواں
رواں دواں۔

کابل، ۲۰، مئی ۱۹۸۳

مذہب

ہم کہتے تھے
مذہب عالمگیر ہے، آفاقی ہے، انسانی ہے
یہ موسمِ بہار کا
ذہن کا سکون ہے
دل کا اطمینان ہے

ہر چمن کی اپنی شان
ہر بوٹے کا اپنا پھل
ہر ٹہنی کی اپنی بُو
ہر ایک گل کا اپنا رنگ
سورج کی بھی اَن گنت شعاعیں ہیں
کسی بھی تمیز بغیر
ہر جگہ چمکتی ہیں
ہر شئے کو چمکاتی ہیں
زندگی، تابندگی اور تازگی پھیلاتی ہیں
ہم کہتے تھے
مذہب روحانیت ہے
عقیدہ ہے
ایمان ہے
ضمیر کا ایک مقدّس انتخاب ہے

ہم کہتے تھے
آدم باپ،
عزم، ہمت، محنت کا مجسّم
اس ویرانے کو بسانے آئے
حوّا ماں کی مامتا
اس دُنیا کو پیار کی گود
یہ انسان
اِک کنبہ ہے اِک خون ہے
اس گھر سے بہشت بنے تو سب کو امن ۔
ہم کہتے تھے
تخت و تختہ، فقیر اور امیری
یہ ریاست، یہ حکومت، یہ قانون
ملکیت کے کھیل
جبر کے اوزار

نفرت کی لکیریں

دین کا دامن ان دھبوں سے پاک
وہ چیخے
کافر، ملحد، دہریہ، غدّار
"کمیونسٹ"
وہ سمجھے تھے
مذہب ہے اک پودا
اس وطن میں پھلتا ہے اور اُس مٹی میں جلتا ہے۔
وہ سمجھے تھے
مذہب ہے اک دیا
گھر تو اُس سے روشن ہو پر گلی میں اندھیرا
وہ سمجھے تھے مذہب بھی جذبات
نِرے مفادات
صرف سودے بازی

سونے کا ترازو لے کر جو بھی تاجر آئے
دین، عقیدہ، گاجر مولی بن کر تُلے بِکے
ہم نے دیکھا
مذہب کے سب اندھے ٹھیکہ دار
نفرت و تعصّب
آگ بگولہ بن کر لپکے اور سب کچھ بھڑکایا
کالا دُھواں چھایا
وہ منحوس اندھیرا جس میں عقل، تمیز، ہوش
فقروں کی تقدیس کی چادر کے تلے جنازے
بازاروں میں اللہ اور بھگوان کا نام
بجلی، رعد، کڑک
جس طرف رُخ کرے انسان کٹے، مرے جلے
کوچے، چھت، دیواریں، فرش
سب لہولہان

فصلیں، پھل باغات اور کلیاں
دھرتی کے حسین سپنے پر زندگی کے پھول
آگ اور خون میں ڈوبے
گھر کے ٹھنڈے چولہے
لُٹی ہوئی عصمتوں کی بے زبان فریاد
بُجھے ہوئے شعلوں کی نشانی فقط راکھ
ہم نے سُنے نعرے
"زندہ باد" اور "جے"
اِس دھرتی کے شیطان نے ایک قہقہہ لگایا

دہلی

من کا من

شعلۂ زرتشت میں یزداں کا عکس
من کا من
نارِ ابراہیم میں اک گوشۂ خلدِ بریں
من کا من
بُدّھ کا نروان

حُسنِ اطمینان کا منزل کدہ
من کا من
دار کے کندے پہ روح اللہ کا رنگِ وصال
من کا من
کرشن چَندر جی کی مُرلی
آتما کی تازگی نور و سُرور
من کا من
یہ حلیفِ جلوہ گاہِ طور
من کا من
وادیٔ بطحا میں جبریلِ امین ، غارِ حرا
لا مکاں کا نُور
تقدیسِ مکان
مَن کا من
خاکداں میں جلوۂ نورِ جمال

من کا من

غمکدوں ہیں، مقتلوں میں لمحۂ تسکینِ روح

من کا من

آج یہ بے چین کیوں ہے

اِس قدر برباد کیوں ؟

ہے جواب ؟

خوف سے لرزاں ہے کیوں اور درد سے

نالاں ہے کیوں ؟

ہے کوئی اس کا جواب ؟

جنگ اور خونیں تشدّد کے علمبردار ایواں کے مکینو!

ہے کوئی اِس کا جواب ؟

خون آنسو اور پسینے کے دلالو!

ہے کوئی اس کا جواب ؟

سونے چاندی کے زیاں وسود کے سوداگرو!

ہے کوئی اِس کا جواب ؟

اقتدار و ملک گیری کی جنوں فرمائیوں کے رہبرو!

ہے کوئی اِس کا جواب ؟

ہے کوئی اِس کا جواب ؟

کابل، ۱۲ ستمبر ۱۹۸۲

گاہے گاہے

زندگی کی اُجاڑ راہوں پر
خارزاروں میں پاؤں چھلتے ہیں
پر دلِ حسن آشنا کی خیر
ایسے لمحے بھی گاہ ملتے ہیں

روشن آنکھوں، حسین چہروں کے
دیپ جلتے ہیں، پھول کھلتے ہیں

شہرِ لیلا، گورِ خموشاں، اہلِ جنوں باہم آویزاں
اپنا گریباں چاک کرے کون، صحرا کو آباد کرے کون

موسمِ گُل پر زہر کا طوفاں بادل بنکر چھائے ہے
ہم دیوانوں کو صحرا میں پھولوں کا غم کھائے ہے

ہم کو تمھارے لطف و محبت کے باوجود
مجبوریٔ رسوم نے محروم کر دیا

۹؍ جولائی ۱۹۸۳ء

کوئی جانے ہے تو لبِ ساحل
ہم کو اک تشنگی نے مارا ہے
زندگی نوکِ خار کی لذت
کیا کریں پھول سے گزارا ہے

۲۸ اگست ۱۹۸۷

جدوجہد

ہر قدم پر خون کے دھبّے
ہر کانٹے میں تارِ گریباں
یہ وہ راہ ہے
پیارے لوگو!
جس سے ہم دیوانے ساتھی

اپنی منزل کی جانب
بڑھ کر گزر آتے ہیں

کابل

باغی

لوگو! میں اک باغی ہوں
اس بستی کی دیواریں
زنجیروں کے حلقے ہیں۔
اس شہر کی اذانیں
کرسی کے ترانے ہیں۔

ہر طرف بازاروں میں
سرمایہ دلّالی کا
سودا کرتا رہتا ہے
قوموں کی آزادی کا
انساں کی شرافت کا۔
عصمت اور شرافت بھی
مال یہاں بکاؤ ہے
گاجر مولی مہنگی ہے
آدم کا خوں سستا ہے
اس حالت میں زندگی
کاندھوں پر اک بوجھ ہے
ایسے میں تو موت بھی
ننگ، شرم اور ذلّت ہے۔
ساری راہیں بند ہیں

ایک ہی راستہ کُھلا ہے
آزادی یا موت کا
یہی میری منزِل ہے
انقلاب زندہ باد

لوگو! میں اک باغی ہوں۔

کابل

رسمِ کوئے یار

چیخیں سُنو!
وہ خٹک دیوانہ
آج شب پکڑا گیا ہے۔
مستِ خرابات ہے
ساتھیو خاموش!

اس بہانے طالبِ دیدار ہے
اک قدم پر ہے لبِ جام
دوسرے پر دار ہے
رسمِ کوئے یار ہے۔

قصّہ ماضی کا

یہ رونا کالی راتوں کا
بس بھول بھی جاؤ چھوڑو بھی
وہ دیکھو خیبر کی چوٹی
کرنوں میں جگمگاتی ہے
وہ نئی سحر کی آمد ہے

وہ نور کی ڈولی آتی ہے
خوابیدہ حسن درّوں کا
انگڑائی لے کر جاگا ہے
سنگین چٹانوں کے سینے
کلیوں کی گدگداہٹ سے
نرگس کی مسکراہٹ سے
بادِ صبا کی آہٹ سے
رشکِ سحر نورِ نظر
حسنِ زماں، رنگِ جناں
ایسے میں جانِ من ساتھی
بس بھول بھی جاؤ چھوڑو بھی
یہ رونا کالی راتوں کا
ایسا قصّہ ماضی کا قصّہ

کابل، ۵ر فروری ۱۹۸۵

اپنی محنت اپنا پھل

آج فضا میں پنگھٹ کے اک آہٹ سی محسوس ہوئی
لو وہ "دُر خو" آ گئی
ان نشیلی آنکھوں کے اشاروں میں
پیار کے گہرے ساغر میں
جو بھی شے تھی ڈوب گئی

مخمور ہوئی

وہ ہواؤں میں ترنم پیار کی خوشبو لے آیا
جیسے کسی ''آدم'' نے،
چھیڑ دیئے رباب کے تار
پتّہ پتّہ، پتھّر پتھّر، سرگم کی تصویر بنا
جو بھی شے تھی جھوم گئی۔
مسحور ہوئے
مشرق میں شفق کا خون
روشن کرنیں لے آیا

پھول خوشی کے دے آیا
راہوں میں مستی کا عالم
میداں میں جنوں کا سماں
چشموں پر دوشیزائیں
کھیلیں، ناچیں، گائیں، کُودیں
گھڑے گر کر ٹوٹ گئے
کنگن چکنا چُور ہوئے
ملّاح بھی دریا کا سینہ چیرتے ہیں اور گاتے ہیں
سُر میں تال ہلاتے ہیں
ساحل کی خوشیوں میں مست
آگے بڑھتے آتے ہیں
نیا گیت سُناتے ہیں
انساں کے پسینے کا
ہر قطرہ

شبنم شبنم، موتی موتی
اپنی محنت، اپنا پھل۔

کابل

غزل

لوگ کہتے ہیں کہ سپنوں سے محبت کی ہے
ہم نے منزل کے حسینوں سے محبت کی ہے

چاند سے، نور سے، شبنم سے، صبا سے، گل سے
اپنی امید کے چہروں سے محبت کی ہے

بزمِ جاناں کا تصوّر بھی سرِ دار رہا
ہم دِوانوں نے اشاروں سے محبت کی ہے

غنچۂ زخمِ جگر، شبنمِ چشمِ نرگس
عمر بھر ہم نے بہاروں سے محبّت کی ہے

زندگی زہر سہی، اہلِ سفر چوُر سہی
یار لوگوں نے سہاروں سے محبت کی ہے

کابل، ۲۰ فروری ۱۹۸۵

دہقان کا بیٹا

مارو اس گندے لڑکے کو
خان کے باغ کے پھل کا چور
نہیں نہیں
چچا!
ماموں!

یہ تو میں نے توڑا ہے
اُس گھنے درخت سے
جِس کو میرے باپ دادا نے برسوں خوں سے
سِینچا ہے

نہیں نہیں
ماموں!
چچا!
ہاں یہ تو میں لایا تھا

اس خوبصورت باغ سے
جس کو ان چھوٹے ہاتھوں سے میں نے پانی دیا ہے

...

چپ رہو بکواسی لڑکے
تُو بھی تیرا باپ بھی چور
باغ کا مالک، پھل کا مالک، تیرا مالک خان
تیرا باپ دہقان۔

۲۸ر فروری ۱۹۸۳

عجوبہ

میں نے اس انسان پہ سوچا
یہ بھی اک عجوبہ ہے
اپنے ہاتھ میں پتھر لیکر اس سے بت تراشتا ہے
پھر اُسے بازار لیجا کر
مال بکاؤ بیچتا ہے

محل میں سجا کر اسے
نام مقدس دے دے کر
ساری عمر پوجتا ہے
یعنی
ذہن اس کا خالق ہے
پر
اپنے وہم کی مخلوق
واقعی اک عجوبہ ہے

یکم مارچ ۱۹۸۵

اے میرے یار، اِن آنکھوں
سے تجھے دیکھ نہ لوں

کوہِ "کیمور" پہ گھنگھور گھٹائیں آئیں
وہ کہیں دُور سے آتی ہے صدا تیتر کی
جھاڑیوں میں بھی نظر آنے لگا ہے گلِ زرد
میں نے بھی سونگھ لیا موسمِ گُل کا مژدہ

میری البیلی سہیلی،
"گُل مکئی"
میری ہم عمر چچیری
"زردو"
ساری ہمجولیاں اُس قصبے کی
آئینے لے کے جُدا بیٹھ گئیں
تیل سرسوں کا لگایا سر پر
سبز خالوں کو حسیں چہروں کے
سب نے پھر تازہ کیے

پر
میں نے قسم کھائی ہے
اپنی نوخیز جوانی کی
تیری مونچھوں کی
کُوٹ کر سنگ کو

ان آنکھوں میں ڈالوں گی مگر
نہ لگاؤں سرمہ
جب تک
اے میرے یار اِن آنکھوں سے تجھے دیکھ نہ لوں
اور تیرے ہاتھوں میں
پرچم مرے ارمانوں کا
سارے مزدوروں کا دہقانوں کا

۵ ر مارچ ۱۹۸۵

آزادی

مجھ سے یہ جھوٹ کی شہرت ہو کہ عزّت لے لو
شہر کی گلیوں میں رسوا کر دو
زلیست میں میرا کوئی نام نہ لے
موت کے بعد نشاں تک نہ رہے
میرے اشعار میں آیا ہے جہاں نام مرا

اس کو بھی جا کے مٹا دو یکسر
ہمسفر دوست جنھیں یاد ہیں قصّے میرے
ہمقدم یار جنہیں یاد ہیں کچھ افسانے
کوئے جاناں
خونِ دل
ہاتھوں پہ زنجیر کا زنگ
وہ دنوں خالی پیٹ
پھر بھی کاندھوں پہ لدا بوجھ منوں
ہم نشینوں کا تغافل
اور
رقیبوں کا ظلم
پیار کا نام سُنا
پر یہ ہما ہے بھی کیا؟
زندگی ایک وسیع باغ مگر سب کانٹے
یا تو سرکار کی جیلوں میں مشقّت قسمت

یا کسی خان کی کھیتی میں بیگار
مجھ سے یہ ساری کہانی لے لو
موت کے بعد میرا نام نہ لو
پر
مجھے میرے "اولس" کے لیے وہ نعمت دو
جسے تم کہتے ہو آزادی ہے
جو میرا ننگ میری غیرت ہے
اور
میرا سب کچھ ہے۔

ا۔ عوام

میرا فن

میرے نقاد
میں جذباتی ہوں ؟
میرے اشعار میں للکار ہے ؟
میری نظموں میں
قصیدوں کا کہیں رنگ نہیں ؟

میری غزلیں!
نہ غزالاں کی ادا ہے،
نہ حسینوں کا سخن ؟
رگِ گل سے پرِ بلبل نہ کبھی باندھ سکا؟
میرے اشعار سے بو آتی ہے
خوءِ مزدور کی بو
خونِ مظلوم کی بو
اور سرمایہ کے قصاب کی منڈی میں پڑی
زندہ لاشوں کی بُو ...

میرے نقّاد!
میرا فن میرا ہے
میرا فن تیرا نہیں، تیرا نہیں
میرا فن میرا ہے

میرے ماحول، مری زلیست، مرے دور کا فن
مرے انسان کا فن

۱۳؍ مارچ ۱۹۸۵

خاموش دھواں

میں زمیں کی پری ہوں اور آسمانوں کا چاند
میرے سبز خال کے آگے سارے تارے ماند
میں جب پانی بھرنے گاؤں کے چشمے پر جاتی ہوں
یا جنگل سے سوکھی لکڑی چن چن کر گھر کو لاتی ہوں
جھرمٹ میں سہیلیوں کے

چال مری چکور کی
سرخ میرا دوپٹہ
وہ کھیتوں میں گاؤں کے البیلے
سب کسی بہانے
چکریں لگاتے ہیں
وہ دیکھو اک سانولا
کیسے "ٹپے" گاتا ہے
دوسرا وہ اک ٹیلے پر
بانسری لیکر بیٹھا ہے
میری طرف دیکھتا ہے
اور
شوق سے بجاتا ہے
اُن کے جگر جلتے ہیں
میرا دل تڑپتا ہے

میں یہ سب کچھ جانتی ہوں
سمجھتی ہوں
ہاں مجھے احساس ہے
شمع کی مانند
دوسروں کی نگاہوں میں خوبصورتی کا جلوہ
اپنا دل انگارے جلتی آگ کے

اور

صرف ایک خاموش آہ
میں پشتو کی بیٹی ہوں
وطن کی دوشیزہ ہوں
میرے سر کے بال بھی اگر
غیر کی ہوا چھو جائے
میرے خاندان کی پگڑی مٹی میں رل جائے

میری چاہت، میری جوانی، میری زیست
صرف ایک خاموش دُھواں

کابل، ۲۲ مارچ ۱۹۸۵

لختئ

(پیشہ ور رقاص لڑکا)

دیکھو اک خوبصورت لڑکا
ڈھول کی تال پہ ناچتا ہے
ناچتا ہے اور ناچتا ہے
ساز کے چھنا چھن میں اپنے جسم کو لہراتا ہے

جسم کا ہر حصہ
موسیقی کی لہروں میں
بادِ بہاری کے جھونکوں میں
پھول کی نازک ٹہنی
دریا کے رواں پانی میں چاند تاروں کا عکس
یہ تماشا!
ڈھول، شہنائی، رقص!
گڑیا کا سا لڑکا
پھول کی مانند چہرہ
حسن اور سنگیت کا یہ امتزاج
واہ!
واہ!!
ہر طرف تماشائی
اپنا سب کچھ بھول چکے ہیں اس منظر میں محو ہیں

شام تھی آدھی رات ہوئی
وہ بھی جاکر ڈھل گئی
ہر طرف تماشائی
بیٹھے بیٹھے تھک گئے
نیند سے بوجھل ہو گئے
پر ناچ اور گانا جاری ہے
اب بھی ڈھول پر تھاپ پڑے تو
"لختئ" لڑکا میداں میں
لٹو بن کر گھومتا ہے
اِس سرے سے اُس سرے تک چکریں لگاتا ہے
تھکتا نہیں ؟
نیند نہیں آتی ؟
لکڑی کا رنگین پُتلا
یا لوہے کی مشین ہے

نہیں، نہیں
یہ بھی اک انسان ہے
بچّہ ہے
ماں کا لاڈلا
میرے، تیرے، خان کے بچّے کی مانند
وہ جو اپنے بستے اٹھائے
یا صحن میں کھیلتے تھکتے ہیں
یہ بھی ساری رات جاگے اور ناچے تو
تھکتا ہے
اور تھکا ہے
نازک نازک پیروں پر
گھنگروؤں نے زخم بھی لگائے ہیں
نیند سے بھی بے چین ہے
سارا جسم چوُر ہے

پر
یہ تو لحنتی ہے
باپ اس کا غریب ہے
کُنبہ اس کا بُھوکا ہے
مرتا ہے تو مرے، مگر ناچے گا کمائے گا
سارا کنبہ سُوکھی روٹی کھائے گا
ناچ اس کی مجبوری ہے
فن نہیں مزدوری ہے۔

کابل، ۱۴ مارچ ۸۵

اِک نظم میرے نام
(مسرت کی)

میرے بابا کے چمن کی کلی
فن کی مسکراہٹ لیکر اس بہار میں آئی
غیرت، شعر، مسرّت
اور
ماضی کی کچھ یادیں

جیسے اک محروم گڈریا
سوکھے ہونٹ ارمانوں بھرا دل
میٹھی میٹھی بانسری پیاری یادوں کی بجائے
سارا ماحول سحر بن کر
شعر بن کر
غیرت، پیت، وفا بن کر
اپنوں کی وَفا،
غیروں کی دغا،
ماضی کی منحوس تلخیوں کو بھلاتا جائے
مُستقبل کا نور
فُرقت کے اندھیروں میں سے سورج بنکر ابھرے
مایوسی کے صحرا میں اک محمل بن کر چمکے
اور
دُور جدائی کے لمحوں میں

جلتے دل کو بخشے
کِھلتی کلی کی رنگینی،

تازگی،
اور زندگی،

دل کی شمع

آتش بھرا جگر

سفر کے اندھیرے

اک طرف سحر کی امید

ارمانوں کا روشن چہرہ

دوسری جانب

یادوں کا ہجوم
آنسوؤں کے موتی

میرا سینہ
سُرخ گلاب

خون میں ڈوبا زخموں کا گلدستہ
دردوں میں بھی خوشیوں کا پیغام
مسرّتوں کی جھولی میں
نفرتوں کا مژدہ
دُور جُدا تنہائی میں
جیسے بیکراں صحرا میں
شفق کے خونیں دامن پر شام کا روشن تارا
منزل کی امیدوں کا پیغام
اِک نظم میرے نام ۔

کابل، ۱۵ر جون ۱۹۸۵

زندگی

سورج
بامِ فلک پر کچھ دیر چمکا
ڈوب گیا
غائب ہو گیا
پر

وہ دیکھو
پھولوں میں رنگینی
پھلوں میں شیرینی
خوشبو بھینی بھینی
واقعات
حادثات
طرح طرح کی اشکال
گوناگوں احوال
ہر سو رمِ حیات
زندگی، دائم، دوام۔

کابل،
۷ر نومبر ۱۹۸۸

میرے وطن کے نوجواں

میرے وطن کے نوجواں
کہ باشعور ہیں
یہ محنتی، بہادر و جسور ہیں
فیضؔ کی شاعری کی جان
جالبؔ کے گیتوں کے ارمان

ہر اندھیرے کے لیئے روشنی کی کرنیں
ہر صبح کے لیئے پھولوں کی بارش
میرے وطن کے نوجواں
کہ باشعور ہیں
یہ لڑکیاں
جو پیکرِ حیات ہیں
فکر و نظر کی مشعلیں
اور
میدان میں
دریائے سندھ کی سرشار موجیں
حادثات
چٹانیں جن کے سامنے خس و خاشاک
یہ لڑکے
زیست کی رواں دواں بہاریں

کوہِ "تاترہ" کی سربلندی

نہ طوفانوں کے غیظ و غضب کے سامنے جھکیں
نہ بہاروں کے حُسن و کرم کے لیے مُڑیں
اپنی منزل
اپنا مقام
اپنی شان
میرے وطن کے نوجواں
کہ باشعور ہیں
ان کی باتوں میں
موسموں کو بدلنے والی گرج
اِن کی نظروں میں
قسمتوں کو تبدیل کرنیوالی چمک
اِن کے ارادوں میں
مُردہ جانوں کو زندہ کرنے والی نفیر

اِن کے نظریات
وقت کی مسیحائی
اِن کی تنظیم
انقلابی قوت
اِن سے مِلتی ہے
قافلے کے ہر قدم کے لیے توانائی
محنت کشوں کے لیے حرکت
وطن کے لیے ثمردار زندگی کا مژدہ
فیضؔ کی شاعری کی جان
جالبؔ کے گیتوں کا ارمان
خٹکؔ کے شعروں میں روحِ رواں
میرے وطن کے نوجوان
کہ باشعور ہیں۔

ماسکو،
۳۱ر دسمبر ۱۹۸۷